Fikr-o-Nasar (Islamabad) 5:9 (1968)

(قسط ۲)

دو مذہبی نظام ہائے فکر

تقلیدی اور تخلیقی

۲ الطاف جاوید

تیسری خصوصیت ۔ زمان کی تخلیقی حرکت کا انکار

وقت کی تخلیقی حرکت کا مفہوم زمانِ خالص کا اپنے آپ کو زمانِ متسلسل میں تبدیل کرتے رہنا ہے۔ اس تبدیلی سے مظاہرِ وجود کے اَن گنت جدید سے جدید تر سلسلوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور یوں ازل سے کائنات اپنی ناتمامی سے تمامیت کی طرف قدم بڑھاتی چلی جا رہی ہے۔ یعنی وقت کی تخلیقی حرکت کا معنیٰ یہ ہے کہ تاریخ اپنے عمل میں ارتقاء پذیر ہے۔ وہ ایک دَور سے دوسرے دَور میں اور دوسرے سے تیسرے دور میں قدم رکھتی ہے اور ہر دَور اپنے ماقبل دَور سے زیادہ وسیع، زیادہ پُرمایہ اور زیادہ مکمل ہوتا ہے۔ ایک دَور گزشتہ دَور سے اپنے احکام و مسائل، اپنی ماہیت و کیفیت اور ہیئت و مافیہ میں قطعاً مختلف ہوتا ہے۔

تاریخ کی حرکت اپنی نوعیت میں چوں کہ تخلیقی ہے، لہٰذا ترقی پسند ہے جو حرکت کے میکانکی تصوّر کی ضد ہے۔ میکانکی تصور میں حرکت تو پائی جاتی ہے مگر یہ حرکت صرف ایک ہی دائرہ میں چکر لگاتی رہتی ہے۔ اس دائرہ سے وسیع تر دائرہ میں قدم نہیں رکھتی۔

تاریخ اور زمان کے تخلیقی تصور سے ماضی پرستی اور قدامت پسندی کے لئے کوئی جواز نہیں ملتا۔ ماضی کا احترام صرف اس معنیٰ میں ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہیئے کہ ملّت کے فکری و عمرانی وجود کی نمو پذیری اور بالیدگی میں ایک تسلسل قائم رہے، مگر ماضی کے احترام کا یہ مفہوم قطعاً نہیں لیا جا سکتا کہ مستقبل کے جدید عامنوں کو نظر انداز کر کے حیاتِ ملّی کی نمو پذیری کے عمل کو روک دیا جائے۔

مذہبی تقلیدی نظام میں اوّل تو حرکت و تغیر کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ اگر اسے گوارا کر بھی لیا جائے تو

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

اُس کے صرف میکانکی تصور کو اپنا لیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس نظام کی نظر میں کائنات کوئی اضافہ پذیر وجود نہیں بلکہ "الآن کما کان" کے مترادف ہے۔ لہذا اس کے نزدیک وہ تمام معاشرتی ادارے جو نزولِ قرآن کے وقت میں موجود تھے، اپنی ہیئت و ترکیب میں ناقابلِ تغیر و اضافہ ہیں۔ فطرت کا ترقی پسند عمل اِن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اور اِن اداروں کے متعلق جو احکام و قوانین وضع ہو چکے ہیں، میکانکی طور پر اُن کی تقلید ہی منشار الٰہی ہے۔

مگر اس تصور کے برعکس انسانی معاشرہ آج جس تخلیقی وارتقائی مرحلہ پہ پہنچ چکا ہے، اس مرحلہ میں غلامی کا ادارہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ لہذا قرآن واحادیث کے وہ احکام و مسائل جو غلامی اور غلامانہ سماج سے تعلق رکھتے ہیں، اس عہد کا مسلمان اُن پر عمل پیرا ہونے سے قاصر ہے۔

قرآن حکیم نے عورت پر مرد کی قوامیت کے دو وجوہ بتائے ہیں۔ ایک تو جسمانی فضیلت اور دوسرے یہ کہ مرد اپنا مال عورت کے نان و نفقہ پر خرچ کرتا ہے۔ لیکن ہمارے عہد کے معاشرہ میں یہ دوسری وجہ قوامیت روز بروز کمزور پڑتی چلی جا رہی ہے۔ عورت بسرعت تمام معاشرہ کے ہر شعبہ میں مرد کے دوش بدوش آتی جا رہی ہے۔ عورت کے اس ترقی پسند عمل کو محض مغرب کی سازش نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ یہ تاریخ کا تخلیقی عمل ہے اور اس عمل سے عورت کی معاشرتی حیثیت، عائلی نظام کی ترکیب و تنظیم اور پردہ کے حدود کے تعین وغیرہ تمام مسائل میں تبدیلی کا آنا لازمی ہو چکا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے مگر میکانکی طور پہ نہیں بلکہ تخلیقی لحاظ سے۔ اس لیے وقت کے پہیئے کو ماضی کی طرف موڑ دینا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

ایک ایسے مسلمان کے لیے جو قرآنِ حکیم کی تعلیم کے مطابق حق تعالیٰ کی شئونِ متجددہ کے عمل کا قائل ہے۔ اِن مذکورہ مثالوں سے قرآنی تعلیمات کی ابدیت کے متعلق پیدا ہونے والے اشکال سے بے یقینی کے مرض میں گرفتار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ قرآن حکیم حیاتِ انسانی کو اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے، حسنِ کامل، حریتِ مطلقہ اور تقدیس کی جس ارفع منزل تک پہنچانا چاہتا ہے، یہ تمام احکام اُس غایت کی طرف جانے والے راستہ کی مختلف منازل ہیں۔ یہ بذاتِ خود مقصود نہیں ہیں۔ اِن کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ حیاتِ انسانی کو اِن کی مدد سے اپنا ارتقائی سفر آسانی سے جاری رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور سمجھ لینی چاہیئے۔ وہ یہ کہ کوئی فرد یا افراد کا کوئی اجتماع قرآن حکیم کے اِن احکام کو اپنی مرضی سے معطل نہیں کر سکتا اور نہ اِن میں کسی طرح کا تغیّر و تبدل کر سکتا ہے۔ معاشرہ اپنے ارتقائی عمل میں جتنا آگے بڑھتا جائے گا، احکامِ قرآنی میں خود بخود ایک تخلیقی و ارتقائی تبدیلی رونما ہوتی جائے گی۔ ہر عہد کے مُسلم ذہن کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کا بغور مطالعہ کرتا رہے۔ اور اِن کی منشار کے مطابق اپنے اجتماعی اور انفرادی وجود میں مناسب تبدیلیاں کرتا رہے۔

قرآنی احکام کے اس طرح تبدیل ہونے سے یہ سمجھ لینا بھی غلط ہوگا کہ اب یہ قطعاً بے کار ہو چکے ہیں اور اپنی عمرانی افادیت کو بالکل کھو چکے ہیں۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ہر حکم اپنے اندر ایک منشار رکھتا ہے اور یہ منشار زمان و مکان کی پابندیوں سے ماورار ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلعم کے عہد مبارک میں جب معاشرۂ انسانی اپنے ارتقائی عمل میں غلامی سے جاگیرداری مرحلہ میں قدم رکھ رہا تھا، احکامِ قرآنی کے منشار نے اپنے آپ کو اُس عہد کے مخصوص معاشرتی تقاضوں کے مطابق ایک مخصوص ہیئت و شرائط کے ماتحت ظاہر کیا تھا۔ اور آج جب کہ وہ عہد بدل چکا ہے، معاشرہ جاگیرداری مرحلہ سے ترقی کر کے نہ صرف سرمایہ داری بلکہ صنعتی مرحلہ تک پہنچ چکا ہے۔ اور اس نئے مرحلہ کے منطقی تقاضوں کے مطابق ایک نئی صنعتی ہیئت و شرائط وجود پذیر ہو رہی ہے تو احکامِ قرآنی میں اگر کوئی تبدیلی آئی ہے تو اُن کی اُس ہیئت و شرائط میں، جسے جاگیرداری عہد نے جنم دیا تھا۔

صنعتی عہد سے پہلے کے معاشروں میں پس ماندہ طبقہ صرف غلاموں کا طبقہ تھا۔ لہٰذا قرآن و احادیث میں غلامی سے متعلق جتنے بھی احکام ہیں، اُن سب کا منشار یہ تھا کہ اُس عہد کے پس ماندہ طبقات، غلام، محروم، مسکین اور یتیم وغیرہ کو انسانی حقوق دے کر اُنہیں ترقی و خوش حالی کی شاہ راہ پر ڈال دیا جائے تاکہ وہ معاشرتی ارتقار کے ساتھ آسانی سے قدم اُٹھا سکیں۔ یہ منشار چوں کہ ماورارِ مکان و زمان ہے، اِس لئے آج بھی وہ اپنے مفہوم و معانی کے ساتھ قائم و دائم ہے اور ہم اپنے عہد کے پسماندہ طبقات کے لئے، جو اُجرتی کسان اور صنعتی محنت کش عوام پر مشتمل ہیں اور جنہیں ازمنہ وسطیٰ کے زرعی غلام کے مقابلہ میں اُجرتی غلام کا نام دیا جا سکتا ہے، اس منشار کو قرونِ اولیٰ کی طرح اِن اُجرتی غلاموں کی ترقی و خوش حالی کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ عہد کے اختلاف کی وجہ سے ہیئت و شرائط مختلف ہوں گے، جن کے ذریعہ یہ منشار اپنے تقاضوں کو پورا کرے گا۔

اپنے پہلے دَور میں اسلام نے عورت کو خاوند اور باپ سے مہر اور جہیز دلاکر، اُسے محنت کرنے اور اُس محنت کے معاوضہ کا مالک تصوّر کرکے، ورثہ میں اُسے قابلِ قدر حصہ وُصول کرنے کا مستحق قرار دے کر، خاوند کے انتخاب میں اُس کی مرضی کو شامل کرکے اور اُسے خُلع و طلاق کے حقوق دے کر اُس کے معاشرتی مرتبہ کو جس طرح بلند کیا تھا، یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ اس عہد کے معاشرہ نے ان حقوق میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے جو حرّیت و مساواتِ نسواں کے قرآنی منشار کے عین مطابق ہیں، بلکہ اس منشار کے مافیہ میں پہلے سے ہی شامل ہیں۔

اس مسئلہ کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اُس عہد میں عورت اور مرد کے ساجی میل جول اور اختلاط کے مواقع نہیں تھے۔ اس بنا پر مرد اور عورت کی علیحدگی کا جو تصوّر اُبھرا تھا، آج کے عہد میں اُس کا اپنی قدیم شکل میں قائم رہنا ناممکن ہے، مگر جنسی آوارگی اور اخلاقی بے راہ روی کا علاج یہ سوچا جاتا ہے کہ عورت اور مرد کی مکمل علیحدگی کو عمل میں لایا جائے۔ یہ علاج نہ صرف اِس عہد کے جدید تقاضوں کے خلاف ہے بلکہ ادھورا اور منفی بھی ہے۔ صحیح اور مثبت علاج یہ ہے کہ تعلیمی نظام کے ذریعہ عورت اور مرد کے شعور کو بدلا جائے، اُنہیں ایک دوسرے کے فطری مقام سے آگاہ کیا جائے۔ ایک دوسرے کی شخصیت کا احترام کرنا سکھایا جائے۔ تبرج جاہلیہ کے معاشرتی اور اخلاقی نقصانات کے متعلق اُنہیں آگاہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ جنسی بے راہ روی کا باعث مرد عورت کا معاشرتی میل جول نہیں بلکہ اس کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب طبقاتی ناہمواری کی موجودگی اور صحت مند تصورِ حیات کا فقدان اور عورت کے فطری اور معاشرتی مرتبہ کے متعلق غلط شعور کا ہونا ہے۔ ہمارا مذہبی طبقہ یورپ کی معاشرتی خرابیوں اور جنسی بے راہ رویوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا عادی ہے مگر ان کے معاشرتی اسباب پر کبھی روشنی نہیں ڈالتا۔

اس مسئلہ سے یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اخلاق اور معاشرتی نظام کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اور کیا اخلاقی زوال معاشرتی نظام کے جس کی اساس معاشی روابط پر مبنی ہوتی ہے، بگاڑ سے جنم لیتا ہے؟۔ کیا یہ دونوں ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کے نظریۂ تاریخ اور امام ولی اللہ کی تشریح و تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی زوال معاشرہ کے استحصال پسند اور استحصال پذیر طبقوں میں بٹ جانے سے وجود میں آتا ہے۔ جنسی آوارگی، تعیش پسندی، حیات کا بے غایت اور نصب العین

سے عاری تصور، انسان کے خدا، معاشرہ یا اپنے ضمیر کے سامنے مسئول ہونے کے نظریہ کے فقدان جیسے تمام نظریات کو استحصال پسند طبقہ جنم دیتا ہے اور پھر ان خیالات و تصورات کا عکس نچلے طبقوں پر پڑتا ہے۔

لہذا ہمارے مذہبی قائدین کا یہ سمجھ لینا کہ جنسی آوارگی محض عورت مرد کے عام میل جول سے پیدا ہوتی ہے، صحیح نہیں اور یہ بات نہ مغرب میں صحیح ہے نہ مشرق میں۔ مغرب ہو یا مشرق جنسی آوارگی اور اخلاقی تباہی نظام معیشت و معاشرت کی بنیادی خرابی کا مظہر ہوتی ہے۔ اس کا علاج وعظ و نصائح اور مغربی ممالک میں ہونے والے جرائم کی فہرستیں مرتب کرنا نہیں ہے، بلکہ معاشرتی اور معاشی بگاڑ کو درست کرنا ہے۔

موجودہ عہد کی سائنسی تحقیقات اور خود قرآنِ حکیم نے بتایا ہے کہ گناہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے۔ انفرادی نہیں۔ شیطان ایک خارجی حقیقت بھی ہے محض داخلی نہیں۔ معاشرتی شر ہمارے داخلی شیطان کے ساتھ تعلق قائم کر کے "گناہ" کو وجود میں لاتا ہے۔ لہذا گناہ سے اُس وقت تک نجات حاصل کرنا ناممکن ہے، جب تک اسلام کے عادلانہ معاشی نظام کے نفاذ، حیات کے غایتی تصور اور تبرجِ جاہلیہ پر مناسب پابندیاں عائد نہ کی جائیں گی۔ اسلامی سوشلزم دراصل اسلام کی ایک تخلیقی تعبیر ہے۔ اور یہی تعبیر اس عہد میں ہمارے ہر مرض کی دوا ہے۔

زمین کو، جو ازمنہ وسطیٰ کے عہد میں پیداوار کا سب سے اہم ذریعہ تھی، نجی ملکیت قرار نہ دینا، فرد کی اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت اور جائداد کا وارث اُس کے بڑے لڑکے کو قرار دینے کی بجائے اُس کے لواحقین اور رشتہ داروں کا حصہ مقرر کر دینا، سائل و محروم کے حق کو نہ کہ خیرات کو مال داروں کے سرمایہ میں قائم کرنا، دولت کو اغنیار کے طبقہ تک محوِ گردش رکھنے کی ممانعت اور محنت کش کو اللہ کا دوست سمجھنا، یہ سب باتیں اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآنِ حکیم کسی شکل میں بھی دولت کے اجتماع (کنز) کو ایک فرد یا چند افراد کے ہاتھوں میں مناسب نہیں سمجھتا اور اگر کہیں ایسا واقعہ ظہور میں آجائے تو فوراً اُسے تقسیم کر دینے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔

قرآنی احکام کے منشار دراصل اُس کی سرمدی حکمت کا ایک حصہ ہیں، جو نسلِ انسانی کے اِس کرۂ ارض پر باقی رہنے تک معاشرہ کے ارتقائی عمل کے لئے ہر مرحلہ پر روشنی مہیا کرتے رہیں گے

اور اس طرح معاشرتی حرکت کے اپنے نصب العین اور غایت تک رسائی حاصل کرنے میں راستہ سے بھٹک جانے کے خوف کا ازالہ ہوتا رہے گا۔

مذہبی تقلیدی نظام کی اساس چوں کہ منطقِ قیاسی پر ہے، جو مابعد الطبیعیات کی فکری منہاج ہے۔ اس لیئے اس نظامِ فکر میں مسائلِ حیات کے متعلق "یا تو الف ہے یا پھر کچھ نہیں" کی اصطلاحوں میں سوچا جاتا ہے۔ یعنی اگر الف الف ہے تو ب نہیں ہو سکتا۔ الف اور ب کے درمیان کوئی رشتہ نہیں پایا جاتا۔ اس کے نزدیک الف کا ایک ہی وقت میں الف ہونے کے ساتھ ب یا کچھ اور ہونا ناممکن ہے۔ کیوں کہ ہر شے یا اُصول کے اوصاف اور خاصیتیں متعین ہوتی ہیں۔ اُن میں کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ایک شے ایک وقت میں وہی ہو سکتی ہے جو وہ ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ یہ اُصول اس لیئے وضع ہوا کہ منطقِ قیاسی اشیاء اور واقعات کا وقت کے بہاؤ میں واقع ہونا تسلیم نہیں کرتی۔ کسی واقعہ یا شے کی حقیقت معلوم کرتے ہوئے یہ 'وقت' کی مقدار اس میں جمع نہیں کرتی۔

منطق قیاسی کے اسی قاعدہ کی رُو سے قرآنی احکام کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے اور اسی اُصول کے مطابق نتائج بھی نکالے جاتے ہیں۔ یعنی غلامی سے متعلق احکام پر یا تو غلامانہ معاشرہ میں عمل کیا جا سکتا ہے، ورنہ کسی دوسرے نظامِ حیات کے حامل معاشرہ میں اِن کو عمل میں نہیں لایا جا سکتا، کیوں کہ غلامانہ معاشرہ اپنے بنیادی خدوخال میں موجودہ سرمایہ دار یا اشتراکی معاشرہ سے مختلف ہے۔ حالانکہ تینوں معاشروں میں وصفِ مشترک ایک انتہائی پس ماندہ طبقہ کی موجودگی ہے، جو غلامانہ سماج میں جسمانی غلام، جاگیرداری سماج میں زرعی غلام اور صنعتی معاشرہ میں اُجرتی غلام (پرولتاریہ) کہلاتا ہے، اور جس کی اصلاح و ترقی اِن میں سے ہر نظامِ حیات میں مقصود تھی اور اب تک ہے۔ مگر تینوں معاشروں میں اس پس ماندہ طبقہ کی معاشرتی حیثیت میں فرق آجانے کی وجہ سے، ان کی ترقی و اصلاح کے لیئے منہاجِ عمل بھی تینوں کے لیئے مختلف ہو گیا ہے۔

قرآنِ حکیم کے ہر حکم کا ایک منشار ہوتا ہے اور حیاتِ معاشرہ کے ارتقائی سفر میں ہر منزل پر اس منشار کی روشنی اور ھدایت کے مطابق ہم نہ صرف قرآنی مقاصد کو پورا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں بلکہ قرآنِ حکیم کو ایک زندہ اور لافانی کتاب کی حیثیت سے اپنی نوخیز نسل اور دنیا کے سامنے پیش کرنے

کے قابل بھی ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا منطقِ قیاسی کے اس مذکورہ قانون پر اگر جدلیاتی نقطۂ نظر سے تنقید نہ کی جاتی تو احکامِ قرآنی کے معتد بہ حصہ کو اس عہد میں متروک قرار دینا پڑتا، اور اس طرح حیاتِ ملّی کی نظری اساس میں ایک عظیم انتشار اور بے مرکزیت پیدا ہو جاتی جس کا نتیجہ تباہی و شکست کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

اگر ہم قرآنی احکام کے منشار کے تصور کو نہ اپنائیں تو پھر ناسخ و منسوخ کے مسئلہ کو ایک واقعی حیثیت سے قبول کرنا پڑے گا اور اس طرح ہمارے فکر میں جو انتشار پیدا ہو گا اور قرآنِ حکیم کی صحت و جامعیت کے متعلق جو شکوک جنم لیں گے، اُن کا بالآخر نتیجہ زمانِ مستقبل کے ہر نئے مرحلہ میں اسلام کے ایک قابلِ عمل اور قابلِ فہم مذہب ہونے کی بجائے اُس کی وقتی حیثیت اور ایک مخصوص معاشرتی عہد کے ساتھ وابستگی کو تسلیم کر لینے کی شکل میں ظہور پذیر ہو گا۔ اسلام کا یہ دعویٰ کہ وہ رہتی دنیا تک کے لئے ایک دائمی اور جاوداں مذہب اور نظامِ فکر و عمل ہے، اپنی ساری افادیت اور صداقت کھو دے گا۔ کیوں کہ عہدِ رفتہ کے معاشرتی اداروں میں واضح تبدیلیاں یا اُن میں سے کسی ادارہ کے وجود ہی کا خاتمہ اب معمولی ذہن والے آدمی کے لئے بھی کوئی رازِ سربستہ نہیں رہا۔ مگر ہمارا ایمان ہے کہ اسلام حیات کی تغیر پسندیوں سے شکست نہیں کھاتا بلکہ وہ جتنے بلند درجہ میں قدم رکھے گی، اسلام اُس کے مزید ارتقاء و تزکیہ کے لئے وہاں موجود ہو گا۔

چوتھی خصوصیت۔ مذہبی گروہ بندی

قرآنِ حکیم نے یہودیت کی خصوصیات پر شدید تنقید کی ہے۔ ان میں جہاں عقیدہ پرستی، ہیئت و رسم پرستی اور ماضی پرستی شامل ہے، وہاں مذہبی گروہ بندی کو بھی خاص طور پہ نشانہ بنایا گیا ہے۔

مذہبی گروہ بندی کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب میں صداقت کے عنصر کو تسلیم نہ کرنا، اپنے مذہب کی عبادات و شعائر جن ظواہر و ارکان میں ادا کئے جاتے ہیں، ان ظواہر کے علاوہ دوسرے ظواہر و ارکان میں ادا کئے جانے والی عبادت و شعائر کو نہ ماننا، جب تک اپنے مذہبی گروہ میں کوئی شامل نہ ہو جائے، چاہے وہ کتنا ہی نیک نفس اور پاک خو ہو، اُس کی نیکی و پاک نفسی کو نجات کے لئے کافی نہ سمجھنا۔

مذہبی گروہ بندی اور اس کی مذکورہ خصوصیات کو اپنانے کا سب سے خطرناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب ایک تخلیقی نامیاتی تحریک نہیں رہتا، جو معاشرتی ارتقاء کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی، اس پر اثرانداز ہوتی اور اس کے اثر کو قبول کرتی ہے۔ آج عیسائیت، یہودیت، بدھ مت اور ہندومت کی الگ الگ ٹولیاں قائم ہو چکی ہیں، جو معاشرتی ارتقاء سے قطعاً علیحدہ اپنے رسوم و صورپرستی کے گھروندوں میں بند ہو کر اپنی حیاتِ مردہ کے دن پورے کر رہی ہیں۔ کیا مسلمان اس کی اجازت دیں گے کہ انہیں مذہبی ٹولیوں میں الا ماشاء اللہ ایک ٹولی اسلام کے نام پر بھی بنا دی جائے۔ جو اپنے گھروندے میں بیٹھ کر دوسرے مذاہب کی ٹولیوں کو ملاحیاں سناتی رہے۔

پانچویں خصوصیت۔ ثنویت پسندی

ثنویت پسند رویہ، حیاتِ انسانی کے ہر مسئلہ کو دو متقابل انتہاؤں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ جن کے درمیان کوئی رابطہ یا رشتہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسے طرزِ تفکر کو ترجیح دیتا ہے جو اشیاء اور ان کے رشتوں کو سمجھنے کے لئے، سب سے پہلے انہیں متقابل و متضاد گروہوں میں تقسیم کرتا اور پھر ایک دوسرے کی مخالف نسبت سے نتائج تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ تحقیق و تفہیم کا جدلی منہاج نہیں ہے، کیوں کہ جدلیات ایک ہی کل میں متضاد قوتوں یا پہلوؤں کے اتحاد کو مانتی ہے۔ یہ تضاد شے کی فطری بناوٹ میں پایا جاتا ہے۔ اور شے کی کلیت کو قائم رکھتے ہوئے اپنا عمل کرتا ہے۔ ایک ہی کل میں پائی جانے والی متضاد قوتوں کے عمل سے شے کی سالمیت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا، بلکہ یہ عمل ساری ارتقائی حرکت کا باعث بنتا ہے۔ اس عمل سے ہر شے اپنی داخلی متضاد قوتوں کے متنازع عمل کے باعث اپنی پہلی ادنیٰ اور سادہ ساخت کو ختم کر کے اعلیٰ اور پیچیدہ تعمیری مراحل میں داخل ہوتی ہے۔

مگر جدلیات کے برعکس ثنویت ارتقائی حرکت کی مخالف ہے۔ ثنویت کے عمل سے ارتقاء کے قدم رُک جاتے ہیں، کیوں کہ یہ ایک کل کی داخلی متضاد قوتوں کا نام نہیں ہے بلکہ یہ خارجی متقابل قوتوں کی صف آرائی کا نام ہے۔ مثلاً ثنویت کی رُو سے حیوان اور انسان دو مخالف و متقابل قوتیں ہیں، جن کے درمیان کوئی رابطہ یا رشتہ نہیں ہے۔ یہ تاریخی ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اپنی نشأۃ اولیٰ سے ہی الگ الگ متضاد قسموں میں بٹی ہوئی ہیں۔ جب کہ جدلیات حیوان اور انسان کے درمیان

نامیاتی رشتہ کو تسلیم کرتی ہے۔

جدلیات وجود کی بنیادی قدر تغیر و حرکت کو مانتی ہے اور تغیر و حرکت کا مفہوم ہے نئی نئی اقدار کی تخلیق کا ہمہ دم ہوتے رہنا۔ ہر شے یا تصور اپنی داخلی متضاد قوتوں کی باہمی کش مکش کی وجہ سے وقت کے سیلان میں ہمہ وقت تبدیل ہو رہا ہے۔ حیوان چوں کہ تغیر و حرکت کے سیلان میں ہے اس لیے اس کی داخلی قوتوں کی باہمی کش مکش نے حیوانیت کی ادنیٰ اور سادہ سطح سے ارتقاء پذیر ہو کر ایک نئی قدر انسانیت کو تخلیق کر لیا۔ جو حیوانیت سے اعلیٰ اور پیچیدہ ہے۔

چوں کہ مذہبی تقلیدی نظام اپنی فطرت میں جدلیات کے برعکس ثنویت کا حامی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رخوں کو ایک کل کے ماننے کی بجائے انہیں متخالف قوتوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ لہٰذا پہلی تقسیم دین و دنیا کی اصطلاح میں کی جاتی ہے۔ یہ مذہبی تقلیدی نظام دین اور دنیا کی متضاد اصطلاحوں میں اپنے مفہوم کو بیان کرتا ہے، اس کے نزدیک اِن دونوں کے درمیان کوئی رابطہ و تعلق نہیں ہے۔ جو کام دینی ہو گا وہ دنیوی نہیں ہو سکتا اور دنیوی دینی نہیں۔ مگر اس کے برعکس یہ دونوں تصور ایک ہی کل سے تعلق رکھتے ہیں یہ دونوں علیحدہ علیحدہ خانوں میں بٹے ہوئے نہیں ہیں۔ ہر وہ دنیوی یا معاشرتی کام جو انسان کے اندر نفسیاتی ارتقاء پیدا کرے، وہ دینی ہے۔ کیوں کہ دین کا مقصد اور مفہوم انسان کی داخلی نفسیاتی حیات کو مسلسل طور پر ترقی دیتے رہنا ہے۔ یہ نفسیاتی تبدیلی دراصل حیوانیت سے خالص انسانیت کی طرف قدم بڑھانا ہے۔

انسانیت، حیوانیت کے مقابلہ میں خالص فکری اور اجتماعیت پسند زندگی کا نام ہے۔ امام ولی اللہؒ نے حیوان اور انسان کے درمیان تین چیزوں کو حدِ فاصل تسلیم کیا ہے۔ یعنی قوتِ ایجاد، رائے کلّی اور ذوقِ جمال۔ دوسرے الفاظ میں تسخیرِ فطرت، خیرِ کلّی اور حسنِ کامل کی تلاش اور اِن کا حصول انسانیت کا دوسرا نام ہے۔ اجتماعی اور انفرادی دونوں لحاظ سے اِن اقدارِ ثلاثہ کو جتنا زیادہ جذب کیا جائے گا، اسی تناسب سے دنیوی زندگی دینی بنتی چلی جائے گی۔

لہٰذا دین اور دُنیا کوئی مسئلہ نہیں ہے، ہر عمل بیک وقت دینی بھی ہوتا ہے اور دنیوی بھی۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ اگر کسی عمل میں حیوانی رُخ یعنی فقدانِ تخیّل۔ انفرادیت پسندی اور عدمِ ذوقِ جمال غالب ہے تو اُسے اصطلاحاً دنیوی عمل تصور کیا جاتا ہے۔ اور اگر انسانی رُخ یعنی تسخیرِ فطرت،

خیر کلی اور ذوقِ جمال کی طرف میلانِ قوی پایا جاتا ہے تو اُسے دین کہہ دیتے ہیں۔

دین اور دنیا کی تقسیم پر زیادہ زور مذہبی تقلیدی نظام اپنی بقاء اور فوقیت کو قائم رکھنے کی وجہ سے دیتا ہے، کیوں کہ اس تقسیم سے اُس کے وجود کی ضرورت اور اہمیت کی ضمانت ملتی ہے۔ اس میں تمام صحت مند اور تعمیری معاشرتی اعمال کو، جیسے راستوں اور پُلوں، پارکوں اور باغوں کی تعمیر، زراعت اور صنعت کو ترقی دینا، حفظانِ صحت کے اُصولوں پر عمل کرنا، گھروں اور بازاروں کی صفائی و پاکیزگی پر زور دینا، بیماری، بے روزگاری اور جہالت کے خلاف جنگ لڑنا، عوام کے رہائشی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اجتماعی پیمانے پر مکانوں کی تعمیر، راستوں کو روشن رکھنے کا بندوبست کرنا، ریلوں، بندرگاہوں اور طیران گاہوں کی تعمیر کرنا اور ترقی دینا، لباس اور رہائش گاہوں کی زیبائش و طہارت کا اہتمام کرنا، سائنس کی تعلیم کے لئے درس گاہوں اور معملوں کی تعمیر و اُستواری، زمان و مکان پر تسلط حاصل کرنے کے لئے ذرائع مواصلات کو توسیع و ترقی دینا، فضا کی تسخیر اور دوسرے سیاروں پر انسانی تمکن کو قائم کرنے کی کوشش کرنا اور پس ماندہ اقوام، عوام کی معاشی، ثقافتی اور علمی حیثیت کو سربلند کرنے کی سعی وجہد کرنا اور اسی طرح کے زندگی کو نکھارنے، حسین تر بنانے اور ارتقاء پذیر کرنے والے دیگر عمرانی اعمال کو بجالانا دنیوی اعمال قرار دے دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ انہیں عمرانی اعمال کو دیانتداری سے بجالانے پر فرد کی نفسیات میں صالح تبدیلیاں رُونما ہوتی ہیں جو اُس کی نجاتِ اُخروی کی ضامن بنتی ہیں۔

اس طرح زندگی میں حُسن، خوش حالی و فارغ البالی، نکھار اور ارتقاء پیدا کرنے والے تمام معاشرتی اعمال کو دنیوی قرار دے دینے سے نیکی کا تصور بُری طرح مسخ ہو چکا ہے۔ کیوں کہ نیکی ان عمرانی اعمال سے ماوراء اور علیحدہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ نیکی کی قدر زندگی کے عمرانی تار و پود سے شدید تعلق رکھتی ہے۔ صحت مند اور تعمیری اعمال ہی دراصل نیک یا صالح اعمال ہیں۔

نیکی کے تصور کو گداگروں کو خیرات دینے، کسی عبادت گاہ کی تعمیر کروانے یا راستہ میں کنواں کھودنے، کیڑوں مکوڑوں اور مچھلیوں کو چاول یا آٹا ڈالنے اور عبادت کے ارکان کو بجالانے تک محدود کر دینے سے عظیم نقصان یہ پہنچا ہے کہ حیاتِ انسانی کا سارا معاشی، سیاسی، تہذیبی اور فکری و علمی کاروبار ایک فرد کی نظر میں نیکی سے بعید اور غیر دینی قرار پا چکا ہے۔ زندگی کو مزکی اور ترقی پذیر بنانے

کی سعی و جہد مسلسل عبادت نہیں رہی بلکہ عبادت محض چند ارکان کے بجالانے کا نام رہ گیا ہے۔

یہ تقلیدی نظام افراد کو بتاتا ہے کہ حیاتِ انسانی کی یہ ساری عمرانی و فکری جد و جہد ایک ذلیل دنیوی عمل ہے جس سے جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ حالاں کہ حیاتِ انسانی اپنے آپ کو آزاد، مقدس اور لافانی بنانے کے لیئے اس جد و جہد کو اپناتی اور اسے بجالاتی ہے۔

قرآنِ حکیم حیاتِ دنیا کا جب ذکر کرتا ہے تو اس سے مُراد حیاتِ انسانی کا بہیمانہ پہلو ہوتا ہے۔ یعنی فقدانِ تخیل، انفرادیت پسندی اور عدم ذوقِ جمال۔ نہ کہ خود زندگی اور اُس کا عمرانی و فکری کاروبار، کیوں کہ ذاتِ باری تعالیٰ خود حیات کا مصدر و منبع ہے، جس نے انسانی مرحلہ میں انفرادی و اجتماعی شکل میں اپنے آپ کو منظم کر لیا ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو کثرتِ عبادت و اذکار سے نفسِ انسانی میں جو تزکیہ و انجلاء پیدا ہوتا ہے اور اس سے فرد کی نفسیات میں جو صالح تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، اُن کے دو پہلو ہیں۔ ایک عمرانی اور دوسرا روحانی۔ کثرتِ عبادت اور متصوفانہ اشغال سے مزکی شدہ فرد اگر حق تعالیٰ کی طرف ارتقا کرتا ہے تو ساتھ ہی عمرانی لحاظ سے وہ بے حد مفید اور تعمیری اعمال بجالانے کی صلاحیت کا مالک بن جاتا ہے۔ اس لیئے یہ سمجھنا کہ عبادت و متصوفانہ اشغال کا حیات کے معاشرتی اور دنیوی پہلو کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، یہ اعمال محض روحانی اور دینی ہیں، شدید غلط فہمی میں مبتلا ہونا ہے۔ فحش و منکر بیک وقت دینی اقدار بھی ہیں اور دنیوی بھی، جو اپنے مضمرات کا اِن دونوں دائروں میں اظہار کرتے ہیں۔ جو فرد حق تعالیٰ کی طرف نفسیاتی طور سے ارتقا پذیر ہوتا ہے وہ ساتھ ہی دنیوی زندگی کے آداب بجالانے میں دیانت و امانت کا حامل بھی ہو جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے فکر اور نبی اکرم صلعم کے عمل کا موضوع انسان اور اُس کی مقدس معاشرتی جد و جہد کے راستے سے رکاوٹوں کو دُور کرنے، اُس کے غلط سمت میں جانے کے امکانات کی نشان دہی کرنے اور اُس کی رفتار کو تیز تر کرنے میں مدد دینا تھا۔ جسے انسان نے روزِ اوّل سے فطرت، معاشرہ اور خود اپنے نفس کے میکانکی قوانین کی جبریت سے آزاد ہونے کے لیئے شروع کر رکھا ہے، اور یہ بات واضح ہے کہ یہ جد و جہد عمرانی اور فکری میدانوں میں ہی جاری رہ سکتی ہے۔ اس کے لیئے دینی اور دنیوی کی تقسیم قطعاً غلط اور گمراہ کُن ہو گی۔

(مسلسل)